R.No. [illegible]
Regd. No.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۳ ۔ شمارہ ۱۴ | ایڈیٹر آل احمد سرور | ۸ اپریل سنہ ۱۹۶۴ء

اداریہ

ہندوستان کے دانشوروں اور ادیبوں سے اپیل

سترہ برس کے بعد ہمارے وطن میں پھر ایک خطرناک بحران نے سر اٹھایا ہے۔ مشرقی بنگال میں ہندو اقلیت پر جو مظالم ہوئے اور قتل و غارت کا جو بازار گرم ہوا اس کی وجہ سے لاکھوں کی تعداد میں پناہ گزیں ہندوستان میں داخل ہونے لگے۔ اس موقع پر ہر شخص کا فرض تھا کہ وہ ان مصیبت کے ماروں کے زخموں پر مرہم رکھتا، ان کو سہولت بہم پہنچاتا اور انھیں پھر سے بسانے کی کوشش کرتا، مگر کچھ لوگوں نے غصے میں آکر کلکتے کی مسلم اقلیت پر حملے شروع کر دیے اور اگر بنگال کی حکومت، مرکزی وزیر داخلہ اور فوج فوری انتظامات نہ کرتی تو نہ معلوم کیا قیامت گزر جاتی۔ کلکتے میں امن قائم ہوا ہی تھا کہ بہار، اڑیسہ اور مدھیہ پردیش کے بعض شہروں میں مسلم اقلیتوں پر حملے شروع ہو گئے۔ بڑی مشکل سے یہ سلسلہ رکا ہے مگر ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ پھر یہ آگ نہیں بھڑکے گی۔

مشرقی بنگال کے شرمناک واقعات کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے، مگر جیسا کہ ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اپنے نصب العین، اپنی قدروں، اپنے مخصوص طریقے اپنے اصولوں کو بھول جائیں۔ ہم ایک سیکولر ریاست ہیں۔ ہمارے نزدیک اس ملک کے سب شہری برابر ہیں۔ ہندو ہوں یا مسلمان، پارسی ہوں یا عیسائی، سکھ ہوں یا بودھ، سب ہمارے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ نہرو جی نے درست کہا تھا کہ اقلیت کے ایک آدمی کی بھی جان بچانے کے لئے ہمیں اپنی ساری طاقت صرف کر دینی ہے۔ ہمیں ہر قیمت پر اپنے وطن میں یک جہتی اور اتفاق کو قائم رکھنا ہے۔ ہم کسی صورت میں مشرقی بنگال کے مظالم کا بدلہ ہندوستان کی اقلیت سے نہیں لے سکتے۔ ایسا کرنا ہر اس چیز کو جھٹلانا ہوگا جو ہمیں عزیز ہے۔ ہماری حکومت ہر قسم کی احتیاطی تدابیر کر رہی ہے، مگر اس موقع پر ہر شہری کو بھی اپنا فرض ادا کرنا ہے، اور ان شہریوں کو جو دانشور اور ادیب ہیں، خاص طور پر ایسی فضا پیدا کرنی ہے کہ ہم اپنے اصولوں پر قائم رہ سکیں اور ہم نے اپنے وطن کی ترقی اور خوشحالی کے لئے جو منصوبے بنائے ہیں وہ پورے ہو سکیں۔ دوسروں کو تلقین کرنے سے پہلے ہمیں اپنے گھر کی خبر لینی ہے۔ ہمیں فرقہ وارانہ منافرت کو جڑ سے ختم کرنا ہے۔ ہمیں اس کا انتظام کرنا ہے کہ ہمارے صنعتی مرکزوں میں تعصب اور تنگ نظری کی آگ نہ پھیلنے پائے۔ ہمیں یہ لحاظ رکھنا ہے کہ اپنے ہمسایہ ملک پاکستان سے ہماری حکومت تبادلۂ خیالات کر رہی ہے۔ دونوں ملکوں کے گھریلو امور کے وزیروں میں بات چیت ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ اس طرح دونوں ملکوں میں ایسے قدم اٹھائے جائیں گے جو میل جول کو بڑھائیں گے اور نفرت و انتقام کی آگ کو کم کر سکیں گے۔ ادیبوں اور دانشوروں کو اپنے اپنے حلقے میں یہ کوشش کرنا چاہیے کہ ہندوستان کے اصول اور تہذیب اور انسانیت کے اصول دلوں میں گھر کریں۔ اردو کے ادیبوں کو خاص طور پر پاکستان کے اردو کے ادیبوں سے یہ اپیل کرنا ہے کہ وہ پاکستان میں رواداری اور اقلیتوں کے ساتھ اچھے

اس اشاعت میں

ہندوستان کے دانشوروں اور ادیبوں سے اپیل (اداریہ)	۱	سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اردو (ہند)	۶
[illegible]	۲	اردو معمہ	۷
اردو مجلس حیدرآباد کا سالانہ ادبی اجلاس	۳	بقیہ: اردو ہندی کو زیادہ موثر بنا سکتی ہے	۸
اردو، ہندی کو زیادہ موثر بنا سکتی ہے	۳-۴	شانتی بھاگل پور کا تعزیتی جلسہ	"
عوام (نظم)	۵	آگرہ کا ایک مشاعرہ	۹
انجمن ترقی اردو اتر پردیش کا انتخاب	۵	حیدرآباد کا مقصدی مشاعرہ	۱۰
زبان کی زندگی کے اسباب	۶	مشاعرہ ساگر	"
		تبصرہ	۱۱-۱۲

سلوک پر اصرار کریں۔ اُردو یک جہتی کی نشانی ہے۔ محبت کی زبان ہے نفرت کے اس ہنگامے میں اسے اپنی امن و محبت کی آواز بلند کرنی چاہیئے۔ اس موقع پر ہمیں گاندھی جی کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ جب دہلی میں فساد ہوا تو کچھ کانگریسی اُن کو رپورٹ کرنے پہنچے۔ اُنہوں نے پوچھا کتنے مسلمان مارے گئے۔ انہیں تخمینہ بتایا گیا۔ پھر اُنہوں نے دریافت کیا، تمہارے کتنے آدمی ان کو بچانے میں مارے گئے۔ معلوم ہوا کوئی نہیں۔ آج جو شخص جمہوریت کی حفاظت کے لئے، سیکولرزم کی آن کے لئے، وطن کی آبرو کی حفاظت کے لئے دل و جان کی بازی لگا سکتا ہے وہی سچا محب وطن ہے۔ پاکستان میں جو مسلمان ہندوؤں کی حفاظت کرتے ہوئے مارے گئے وہی سب سے اچھے پاکستانی کہے جا سکتے ہیں۔ پہلے اپنوں کو اُن کا فرض یاد دلایا جاتا ہے۔ اس لئے ہم نے اپنے ہم وطنوں سے یہ اپیل کی ہے کہ وہ اس وقت ان تمام قدروں کی ہر قیمت پر حفاظت کریں جن کی وجہ سے ہمارا وطن سربلند ہے۔ ہمیں پاکستان کے ادیبوں سے بھی یہ کہنا ہے کہ وہ پاکستان کے ماتھے پر جو داغ لگ گیا ہے اُسے دور کریں اور وہاں اقلیت کیلئے امن اور انصاف کی فضا قائم کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔ ع ... ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

یومِ سریر

بلبل بہار علامہ سریر کابری مرحوم کی یاد میں ایک عظیم الشان مشاعرہ زیر اہتمام بزم سریر قاسمی ہائی اسکول گیا میں منعقد ہوا۔ مشاعرے کا افتتاح عبد القیوم انصاری صاحب وزیر صحت نے فرمایا اور علامہ مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔

جناب غلام سرور ایڈیٹر سنگم نے صدارتی تقریر میں اُردو کے مسائل پر پُرزور اور مدلل تقریر فرمائی۔

صدر کی تقریر کے بعد مشاعرے کی کارروائی شروع ہوئی۔ مقامی شعراء کے علاوہ بیرونی شعراء نے بھی کافی تعداد میں شرکت کی۔

غیر مقامی شعراء: پروفیسر حفیظ بنارسی۔ پروفیسر اثر امام، شرف بہاری، نجوم خضر، ملک بیدی، عظیم آبادی، منظر کاشمیری، مہدی حسن مہدی، شاغل قادری، ظہیر غازیپوری، جمال پھلواروی، حلیم اللہ حالی، مشیر جھنجھانوی، محبوب نظر، حیرت گونڈوی، گلشن الشیبانی وغیرہ

مقامی شعراء: بسمل سہسرامی، فرحت القادری، منیر واحدی، مختار احمد عاصی، حکیم یوسف، صابر رشیدی، حسن بہاری، نجمی حیدری، ادیب حسن ادیب، جنید اختر۔ مشاعرہ ساڑھے دو بجے شب تک چلتا رہا۔

(مختار احمد عاصی وارثی جوائنٹ سکریٹری)

اُردو مجلس حیدرآباد کا ماہانہ ادبی اجلاس

اُردو مجلس حیدرآباد کا ماہانہ ادبی اجلاس، اتوار ۲۹ مارچ کو شام کے ۶ بجے اُردو ہال واقع حمایت نگر میں صدر اُردو مجلس رائے جانکی پرشاد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب اختر حسن سابق مدیر پیام نے "قطب شاہی دور کا فارسی ادب" کے زیر عنوان معلوماتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ قطب شاہوں نے دو سو برس حکومت کی اور ان کے دورِ حکومت میں حیدرآباد اُردو اور فارسی ادبیات کا بڑا مرکز رہا۔ جمشید قلی اس خاندان کا پہلا فارسی نغز گو شاعر تھا۔ اور ابراہیم قلی کے زمانے سے گولکنڈے کی صحیح ادبی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اسکے محل میں ایک حصّہ ادبی کلب کی حیثیت سے استعمال ہوتا تھا اور ہفتہ واری تعطیل منگل کے دن یہاں ادبی محفل منعقد ہوتی تھی۔ مسٹر اختر حسن نے کہا کہ سولھویں اور سترھویں صدی کا زمانہ نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ دہلی میں اکبر اور ایران میں صفویہ خاندان اور انگلستان میں ملکہ الزبتھ کی حکمرانی تھی۔ شکسپیر بھی اسی زمانہ میں پیدا ہوا۔ یہی دور محمد قلی قطب شاہ کا دکن اور جنوبی ہند میں تھا۔ جہاں دکنی اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی ادبیات کا بھی احیا ہوا۔ اس کے دربار سے فارسی کے ایک سو پچاس شاعر و ادیب وابستہ تھے۔ جن میں فرسی۔ روح الامین۔ میر محمد مومن۔ اسد اللہ وجہی اور خواصی مشہور ہیں۔ جناب اختر حسن نے ان شعراء کے علمی و ادبی کارناموں۔ تصانیف اور کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے معلوماتی تقریر کی اور سلطان محمد قلی کے شاہی کتب خانے کی تفصیلات سے بھی واقف کرایا۔

مسٹر سری نواس لاہوٹی نے ہندی کے شاعر سوریا کانت ترپاٹھی نرالا کی شخصیت اور شاعری پر مضمون سناتے ہوئے کہا کہ نرالا نے حسن کی محفل میں ترانے چھیڑے، انقلاب کی بزم میں آتشیں راگ گائے۔ اس کی شاعری میں فرد اور سماج ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ نرالا صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ پہلوان، موسیقار، ادیب اور مصوّر بھی تھے۔ خودداری کا یہ عالم تھا کہ ان کی عمر کا ایک بڑا حصّہ افلاس اور تنگدستی میں بسر ہوا۔ لیکن انہوں نے کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ محفل شعر و سخن میں حمید۔ شاد۔ خواجہ یوسف الدین، اسد انصاری۔ احساس ناظمی۔ رابعہ رعنا۔ فیض الحسن خیال۔ ناز حیدر۔ صلاح الدین نیر۔ رحمٰن جامی۔ برق یوسفی۔ شوق یمانی۔ تاج۔ مجبور اور مسافر گلنڈوی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

(و۔ خ۔ ش)

فراق گورکھپوری مترجم: اشفاق محمد خاں ایم۔ اے

اُردو، ہندی کو زیادہ موثّر بنا سکتی ہے

انسانی فطرت کی یہ ایک عجیب ستم ظریفی ہے کہ اکثر ہم کسی مرغوب شئے سے اُس وقت تک محبت نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم بیک وقت کسی دوسری شئے سے نفرت نہ کرنے لگیں اور یہ بات اس چیز کے اپنے تضاد یا تحریف کی بنا پر ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کی تاریخ متضاد نظریوں کے امتزاج کی ایک درد بھری داستان ہے۔ یہ درد اپنی شدت کے مختلف مدارج پر پہنچ کر فرقوں اور قوموں کی زندگیوں میں خوف وہراس پیدا کرتا رہتا ہے۔

دراصل یہ درد ارتقا کی خواہش کا درد ہے جسے نطشے نے یوں بیان کیا ہے کہ "سارا ارتقا، مادّے کو روحانی کیفیت بخشنے کی کاوش اور کرب کا دوسرا نام ہے"۔ یہ درد و کرب تاریخی جدلیات کا کارنامہ ہے۔ چنانچہ اتحاد و اتفاق کی قوتوں کو نفاق و نفرت کی طاقتوں سے ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اسی درد کو آج ہم ایک ہی زبان اردو اور ہندی کی بہنوں کے درمیان کشمکش کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔

مشترکہ زبان

گذشتہ صدی کے وسط تک اُردو زبان نثر و نظم کی زبان بن چکی تھی اور وہ تمام شمالی ہند میں پشاور سے لے کر بہار تک، سری نگر سے مدھیہ پردیش تک امور مملکت اور تجارتی لین دین کی زبان تھی۔ اُس نے مقامی تہذیب و تمدن اور شہری زندگی کو چار چاند لگا دئے تھے۔ بنگال، ڈھاکہ اور مرشد آباد اُردو کے اہم مراکز تھے۔ بمبئی اور جنوبی ہند اور کھٹمنڈو (نیپال) کے ہر اہم شہری مرکز کی تہذیبی زبان اور بین صوبائی امور، رسل و رسائل کا ذریعہ بھی تھی اور اسے ملکی اتحاد و یکجہتی میں ایک کڑی کی حیثیت حاصل تھی۔

اس پورے علاقے کے شہری اور قصباتی مراکز میں ہندو حضرات زبان کو سماجی امور و معاملات کی زبان بنانے اور اسے ترقی دینے کے سلسلے میں پہل نہ کر سکے اور اس کی رہنمائی میں بھی ناکام رہے۔ مگر اس بات پر تعجب یا تاسف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسلم سلطنت ایک قومی سلطنت تھی جو اپنے اندر شہریت، جدیدیت اور اتحادی قوت کی بڑی صلاحیت رکھتی تھی۔ اسی اتحادی صلاحیت کی بنا پر اُردو نے بے حد سُرعت کے ساتھ رواج پایا۔ اور ایک ایسی سیاسی تحریک اختیار کی کہ ہندی کے تمام لغات، روزمرہ، محاورات، فقرات و امثال اور کھڑی بولی یا دلی کی ترقی پذیر زبان کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔

اُردو سے بے اطمینانی

اُردو اپنی تمام دلکشیوں اور لطافتوں کے باوجود ہندوؤں کے تہذیبی میلان ان کے جذبۂ وطنیت کی بے پایاں آرزوؤں کو تسکین بہم نہ پہنچا سکی۔ اُردو میں ہندو جمالیات کے ارفع احساسات کا اکثر فقدان رہا۔ نتیجے کے طور پر ہندوؤں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اُردو سے، جہاں وہ قدم جما چکی تھی، نفرت اور بددلی پیدا ہونے لگی۔ یہ بددلی، اور بے اطمینانی، ہمدردی اور غور و فکر کی مستحق تھی۔ مزید براں یہ کہ اُردو زبان و ادب، سنسکرت زبان و ادب کے دلکش الفاظ اور دلچسپ و موثر لب لہجہ کو بھی اپنا نہ سکے۔ اُردو کے فارسی رسم خط کی بنا پر ہندو ناگری رسم خط اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ غرضکہ ابھی ہندوستانی دیومالا، قصص و حکایات، ہندو فلسفے اور ادب کے رمزو کنایات، مذہبی رسم و رواج، خانگی اور سماجی زندگی کی روایات و تصورات، تہذیبی فضا، سماجی اور ذاتی فلسفۂ حیات، اُن کے برت، تہواروں اور میلوں ٹھیلوں کی تلمیحات جیسے تمام قابل قدر موضوعات کی زرخیز فصل سے اُردو کو فیضیاب ہونے کی ضرورت ہے۔

اردو میں نازک احساس جمال، روحانی مسرت و برکت شیریں لہجے اور اعلیٰ بصیرتوں کی کمی نہیں، ان کے ماسوا بعض بڑے گہرے امتزاج بھی پائے جاتے ہیں جن کا مسکن غروب آفتاب کی شفق، سمندر کی وسعت، سبز زمین تازہ ہوا اور آدمی کا ذہن ہے"۔ ان تمام کیفیتوں کے باوجود اُردو میں کچھ اور بھی ہونا چاہئے تھا۔ یعنی اس میں "جذبۂ سوز و گداز اور انسانی زخموں کو مندمل کرنے کی قوت" جسے "شانتی رس اور کرُنا" (करुणा) کہا گیا ہے اور جو ہندو روایات کا بیش بہا اثاثہ ہے اور جسے اُردو میں ابھی جگہ حاصل کرنا ہے۔

اُردو کے لب و لہجے، مزاج اور رفتار سے متعلق یہ بات عموماً بے چینی کے ساتھ محسوس کی گئی ہے کہ اس میں ہندو تہذیب کے امن و ضمانت اور توازن کا فقدان ہے۔ بہر حال اُردو کو ابھی احساس فطرت، تصوف کیچپ کی شاعری، ہندوستانی عورت کے تصورات، مادّی دُنیا کی عظمت کا احساس، زندگی اور کائنات پر ایمان و اعتقاد، بہترین ہندو ادب کی بوباس، انسانیت، سادگی

احساسِ قربت، بے تکلفی، مادی اور روحانی یا حواس اور فوق الحواس کے شدید جذبۂ احساس کی ہم آہنگی اور یگانگت کا بھرپور اظہار کرنا باقی ہے۔

مسلم تصوّف اور ہندو بھگتی کے تصورات میں کئی مقام پر بڑی مماثلت تھی۔ لیکن اوّل الذکر آریائی صوفی ازم کی بہ نسبت ناکافی تھا۔ اُردو جسے اپنی طبیاعی اور رمزیت، چمک دمک، آب و تاب، وجدان اور برجستگی میں فوقیت حاصل تھی وہ یقیناً یونانی ادب العالیہ کی مستحکم معقول اور ٹھوس روایات کی حامل تو نہ تھی لیکن اُس نے نیو کلاسیکی یا آگسٹن عہد کے اور یورپ کے ادبی تصوّرات کی نمائندگی بہت خوبصورتی سے کی۔ پھر بھی اکثر گہرے جذبات کے اظہار میں انداز بیان سے تمسخر پیدا ہوا، اور واقعیت کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ اُردو ادب میں ہندو نشاۃ ثانیہ کا ذکر بہت عرصہ پہلے سے ہونا چاہیئے تھا۔ ہندو مسلم تہذیبی یک جہتی کو نہایت مضبوط اور شاندار بننا چاہیئے تھا، خصوصاً ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے اُسے اور بھی زیادہ مہذّب اور مستند ہونے کی ضرورت تھی۔ اس لیئے کہ نامکمل اتحاد اور ادھورے امتزاج کوئی معنی نہیں رکھتے۔

ہندی کی تحریک ان تمام باتوں کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ یہ بغاوت ایک صحت مند اور مفید ردعمل تھا اور ہمدردی کا مستحق بھی۔ لیکن نہ تو ہندی کی طرف سے اور نہ ہی اُردو کی جانب سے اس بغاوت کے اسباب پر کبھی اظہار کیا گیا اور بجائے اُس کے کہ اس مسئلہ پہ تہذیبی دلائل کی روشنی میں غور و فکر ہوتا۔ یہ مسئلہ نزاعی مسئلہ بنا دیا گیا۔ تعمیری اور اثباتی نقطۂ نظر کے بجائے تخریبی اور منفی راستے اختیار کیئے گئے۔

خطرناک غلطی

تعلیمی دُنیا کے تمام اہم امور میں اُس کی قسمت کے بنانے یا بگاڑنے میں ایک بڑی غلطی ہوئی یعنی ہمارے تعلیمی اداروں میں ایک سو سال سے زیادہ عرصے تک اُردو ہندی کو علیحدہ علیحدہ پڑھائے جانے کا فیصلہ ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی۔ ان دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے جُدا کر دینے کے لیئے ان کی الگ الگ تعلیم دینے کا فیصلہ ایک فاش غلطی کے مترادف تھا۔ چنانچہ دونوں زبانوں کے درمیان خلیج بڑھتی گئی اور یہ خلیج اس قدر بڑھی کہ ان میں کوئی رشتہ باقی نہ رہا۔ اور اب ناممکن سا ہے کہ اس خلیج کو پُر کیا جا سکے۔ نتیجتاً آج دونوں زبانیں زخم خوردہ اور خون آلودہ معلوم ہوتی ہیں۔

ہندی نے اُردو کی بہ نسبت زیادہ نقصان اُٹھایا اُردو صرف سنسکرت کے چند الفاظ و محاورات سے ہی محروم رہی مگر ہندی نے اپنے ہاتھ پیر کاٹ لیئے۔ اور آج وہ ایک دوالیہ زبان بن کر رہ گئی ہے۔ اس میں ہندوؤں کی تہذیبی زندگی نیز مشترکہ قومی زندگی کی نمائندگی کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رہی۔ اب ہندی اُسی وقت دلکش اور کامیاب زبان بن سکتی ہے جب کہ وہ ہندی کے اُس حصّے کو اپنا لے جس کا نوّے فی صدی حصّہ اُردو کے پاس ہے۔

ہندی اس مقصد کو لے کر شروع کی گئی کہ وہ ہماری زبان و ادب کو غیر ملکی عربی اور فارسی الفاظ سے آزاد کرائے۔ لیکن اُس کے اس مقصد نے خود ہندی کے ہزاروں خالص الفاظ و محاورات کو کھو دیا اور تقریباً بیس کروڑ ہندی بولنے والوں کو ہندی کے زندہ محاوروں اور قوتِ گویائی کے جذبہ سے محروم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو، ہمارے عوام کے احساسات و خیالات کے اظہار کا ایک شاندار وسیلہ بن گئی۔

ہندی کی تحریک کو شروع ہوئے ایک سو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔ اُس وقت سے جن ہندوستانیوں نے ہندی میں لکھنا شروع کیا، باستثنٰے چند وہ محض کھڑی بولی کی بنیادی گرامر اور ابتدائی محاورے سے ہی واقفیت رکھتے ہیں۔ اُن کا حال گویا اسکول کے ایک ایسے لڑکے کی طرح ہے جو گرامر کی نصابی کتاب کے کچھ قاعدوں اور لاطینی ڈکشنری کی مدد سے انگریزی نثر و نظم کی قطع برید کر کے ایک نیا اسلوب پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

ہندی نے اپنی کوشش میں کہ وہ ہمیں ایک نئی زبان عطا کرے گی، ایک ایسی زبان عنایت فرمائی ہے جسے کوئی زبان ہی نہیں کہا جا سکتا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑے مجرم وہ لوگ ہیں جو کھڑی بولی کے ہندی شاعر بھی ہوئے ہیں۔ اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ ہندی زبان کو کس طرح ایک مُردہ، بے جان، بیہودہ، بھونڈی اور سستی زبان بنایا جا سکتا ہے تو آپ آج، کل اور پرسوں کے ہندی شعرا کا مطالعہ فرمائیں، (ان میں مستثنیات بھی ہیں مگر کیا واقعی ہیں ؟) ہندی نثر بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

(باقی صفحہ ۸ پر)

وحید مرزا

عوام!

شاہ راہوں پہ گلی کوچوں میں بازاروں میں
رہ گزاروں پہ سمن زاروں میں گلزاروں میں
میں نے افسانوں کا اک سیلِ رواں دیکھا ہے
رقص میں جیسے کوئی عزم جواں دیکھا ہے
میں نے دیکھا ہے شب و روز یہ سیلاب رواں
دل کے غم خانے میں لہراتے ہوئے برقِ تپاں
حسب معمول کسی دھن میں گزر جاتا ہے
نغمۂ موج رواں بن کے بکھر جاتا ہے
میں بھی جیسے کوئی خاموش تماشائی ہوں
دل میں اک فکر لئے جیسے کہ سودائی ہوں
رہ گزاروں سے بھی چپکے سے گزر جاتا ہوں
مرغزاروں سے بھی چپکے سے گزر جاتا ہوں
جوئباروں سے بھی چپکے سے گزر جاتا ہوں
لالہ زاروں سے بھی چپکے سے گزر جاتا ہوں
دل کے رازوں کو بھی چہروں سے پڑھا ہے میں نے
وقت کے ماتھے کی لکیروں سے پڑھا ہے میں نے
میں نے اک دھند سی ہر سمت بھی دیکھی ہے
میں نے رخساروں کے غنچوں پہ نمی دیکھی ہے
میں ہر اک موڑ سے چپکے سے گزر جاتا ہوں
دل میں آنکھوں میں لئے غم کا اثر جاتا ہوں
میں نے ہر موڑ پہ رکتے ہوئے سوچا ہے یہی
میں نے ہر موڑ سے چلتے ہوئے سوچا ہے یہی
جیسے ہر موڑ پہ ہنگامے ہی ہنگامے ہیں
شور ہی شور ہے آوازے ہی آوازے ہیں
جو کہ ہنگامِ قیامت میں بدل سکتے ہیں

چپکے چپکے میں یہی سوچ رہا ہوں اے دوست
دھیرے دھیرے میں یہی سوچ رہا ہوں اے دوست
غم و آلام میں ڈوبی ہوئی پلکوں سے سدا
چشمِ پُرنم کے ابلتے ہوئے چشموں سے سدا
صرف بے جان سے آنسو ہی نہیں نکلیں گے
ان سے شعلہ بھی شرارہ بھی نکل سکتا ہے
ان سے دہکا ہوا لاوا بھی نکل سکتا ہے

انجمن ترقی اُردو اتر پردیش کا انتخاب

آنند نرائن مُلا صدر، قاضی مختار احمد سکریٹری

لکھنؤ۔ ۳۰ مارچ۔ اٹھارہ ضلعوں کے نمائندے جو انجمن ترقی اُردو کی کونسل میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ پنڈت آنند نرائن مُلا کو ریاستی انجمن کا صدر اور قاضی مختار احمد صاحب کو سکریٹری چنا۔ اس کے علاوہ جو انتخاب ہوا وہ یہ ہے:۔

نائبین صدر۔ حبیب الملک صاحب ملیح آباد۔ نائب صدر بیگم سلطانہ حیات صاحبہ لکھنؤ۔ قاضی محمد عدیل عباسی بستی۔ محمد احسان حسین امروہہ شیو ناتھ پرشاد بنارس۔

نائب سکریٹری۔ شجاعت علی سندیلوی منتخب ہوئے اور طے پایا کہ ایک نائب کا انتخاب سکریٹری صدر کے مشورے سے کرے گا۔

ممبران مجلس عاملہ ذیل کے حضرات منتخب ہوئے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی۔ حیات اللہ انصاری (لکھنؤ) شمبھو ناتھ پانڈے (الہ آباد) راحت علی خاں (بہرائچ) دوارکا سہائے (بنارس) اقرار احمد (مراد آباد) عطاء اللہ خاں (میرٹھ) محمد سلطان (جونپور) عبدالرشید (جالون) بدرالحسن (پیلی بھیت) رشید احمد (بارہ بنکی) فدا حسین (لکھنؤ) حکیم اسعد (بلند دانی) حکیم ابوالکلام (گورکھپور) ابوالبیان (شمس آباد) گیانی مہندر سنگھ (لکھنؤ) محمود سلیم (کانپور) معین الدین (آگرہ) سلیمان (دھنی بستی) حکیم عبدالمنعم (بلرام پور) وقار الحسن (رام پور) ظہور احمد ظہور (سہارن پور) ایک گونڈہ کا نمائندہ بھی شامل کیا جائے گا۔ سب انتخاب اتفاق رائے سے ہوا۔

انتخاب سے پہلے مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا تھا جس میں یہ مسئلہ پیش ہوا تھا کہ امروہہ میں ایک الحاق شدہ شاخ کی موجودگی میں ایک شاخ اور بن گئی ہے ایسی صورت میں کیا کیا جائے اور یہ اختلاف کس طرح خوش اسلوبی سے ختم کیا جائے۔ مجلس عاملہ نے اس معاملے کو طے کرنے کا کام اپنے ممبر محمد احسان حسین صاحب پر چھوڑ دیا۔

نمائندوں نے اپنے علاقوں کے مسئلوں پر روشنی ڈالی۔ ریاستی شاخ کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ اس کی مسلسل جد و جہد سے آخر بنارس میں جہاں چودہ سال کی مسلسل کوشش کے باوجود ایک اسکول میں اُردو نہ تھی اب تین اسکولوں میں اُردو ذریعہ تعلیم قرار پاگئی ہے۔ ان کے علاوہ جونیئر اسکولوں میں بھی اُردو آگئی ہے۔ محمود آباد کالون اسکول میں بھی آٹھ سال کے بعد اُردو رائج کرانے میں کامیابی ہوئی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ کہاں کہاں کن اسکولوں کے بارے میں کیسی جد و جہد ہو رہی ہے۔

جلسوں کی صدارت پروفیسر مسعود حسن رضوی نے کی۔ نمائندوں کے قیام کا انتظام سنٹرل ہوٹل امین آباد میں کیا گیا تھا۔ وہیں جلسے بھی منعقد ہوئے۔

(قومی آواز)

اقبال کرشن

زبان کی زندگی کے اسباب

زبان کی زندگی کا مفہوم (زبان کی زندگی "مطبوعہ ہماری زبان") صاف ہو جانے کے بعد، اب ہمیں ان اسباب کا جائزہ لینا ہے جن پر کسی زبان کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔

آبادی۔ زبان کی زندگی کا سب سے بڑا اور پہلا سبب ہے آبادی۔ جس طرح کسی ملک کی طاقت، تہذیب، ثقافت وغیرہ اس ملک کی آبادی پر منحصر ہیں، اسی طرح ایک زبان کی ترقی، زندگی، وسعت وغیرہ اس کی آبادی پر منحصر ہیں۔ آبادی کی کثرت سے زبان پھیلتی ہے؛ آبادی کی مالی خوشحالی سے زبان کو مالی حمایت حاصل ہوتی ہے؛ آبادی کی تعلیمی قابلیت سے اس زبان کے ادب کو فائدہ پہنچتا ہے؛ آبادی کی خوش تہذیبی اور بد تہذیبی زبان و ادب پر اثر انداز ہوتی ہیں؛ آبادی کی توانائی زبان کی توانائی ہوتی ہے۔ اگر آبادی لسانی طور پر سرد ہی ہے تو زبان کی زندگی خطرے میں ہے۔ اگر آبادی مالی حیثیت سے ممتاز نہیں تو ادب کی اشاعت دھیمی ہوتی ہے۔ غرض زبان راست طور پر آبادی کی اچھائیوں برائیوں سے متاثر ہوتی ہے۔

علاقہ۔ دوسرا ضروری سبب ہے علاقہ۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب آبادی ہوگی تو یقیناً علاقہ بھی ہوگا۔ خیال غلط ہے۔ آبادی خانہ بدوش بھی ہوتی ہے، صحرا نورد بھی۔ آبادی غیر متحد اور منتشر بھی تو ہوتی ہے۔ تو زبان کا علاقے سے گہرا تعلق ہے۔ علاقے کی خصوصیات سے زبان متاثر ہوتی ہے۔ اگر علاقہ گاؤں، دیہات، جنگل، بیابان یا ریگستان ہے تو زبان کا بھی یہی حال ہے۔ اگر علاقہ شہر ہے، ترقی یافتہ ہے، صنعتی ہے، زراعتی ہے، علمی مرکز ہے، سیاسی مرکز ہے، بین الاقوامی منڈی ہے یا ساحلی ہے تو زبان بھی اسی مناسبت سے متاثر ہوگی۔ اگر علاقہ لسانی طور پر قلعہ بند ہے زبان بھی دوسروں کے تصادم سے محفوظ ہے۔

حکومت۔ یہ تو یقیناً بتانے کی ضرورت نہیں کہ زبان کی زندگی سے اور حکومت سے کیا تعلق ہے۔ حکومت مہربان ہے تو زبان سرکاری زبان ہے، حکومت دشمن ہے تو زبان فنا پذیر ہے۔

اغیار۔ اغیار اگر متعصب ہیں، زبان سے نفرت کرتے ہیں، آبادی کے دشمن ہیں تو زبان کو خطرہ لاحق ہے۔ اگر اغیار خندہ جبیں ہیں، انصاف پسند ہیں، علم پرور ہیں تو زبان خوش قسمت ہے۔

ادارے۔ زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے اداروں کا قیام ضروری ہے۔ اگر ادارے شکست ہیں، بے ایمان ہیں، بنیوں کی خصلت رکھتے ہیں، زر اندوز ہیں، زبان پرور نہیں تو زبان بد متاثر ہے۔ اگر ادارے فعال ہیں، ایماندار ہیں، زبان پرور ہیں تو زبان خوش متاثر ہے۔

اب ہمیں اپنی زبان کا جائزہ لینا چاہیئے کہ آیا ہم زندہ ہیں، بے ہوش ہیں یا مردہ ہیں۔ اگر ہم زندہ ہیں تو ہمیں مزید توانائی کی کوشش کرنی چاہیئے؛ اگر ہم بے ہوش ہیں تو ہمیں ہوش میں آنا چاہیئے؛ اگر ہم مردہ ہیں تو ہمیں کوئی حیات بخش قدم اٹھانا چاہیئے۔

یاد رکھیئے انتظے، جب آدم نے جب دنیا میں قدم رکھا تو حالات سے مایوس ہو کر خودکشی نہیں کر لی، زندگی کی جد و جہد میں لگا رہا؛ اور آج آدم کی اولاد خلا پرواز ہے! جے ہند۔

سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اُردو ڈاسنہ

انجمن ترقی اُردو ڈاسنہ نے اُردو خدمت کا ایک بہترین میدان تلاش کیا یعنی جامعہ اُردو علی گڑھ کا سینٹر قائم کرایا جس کا پہلا امتحان نومبر ۱۹۶۳ء میں ہوا۔

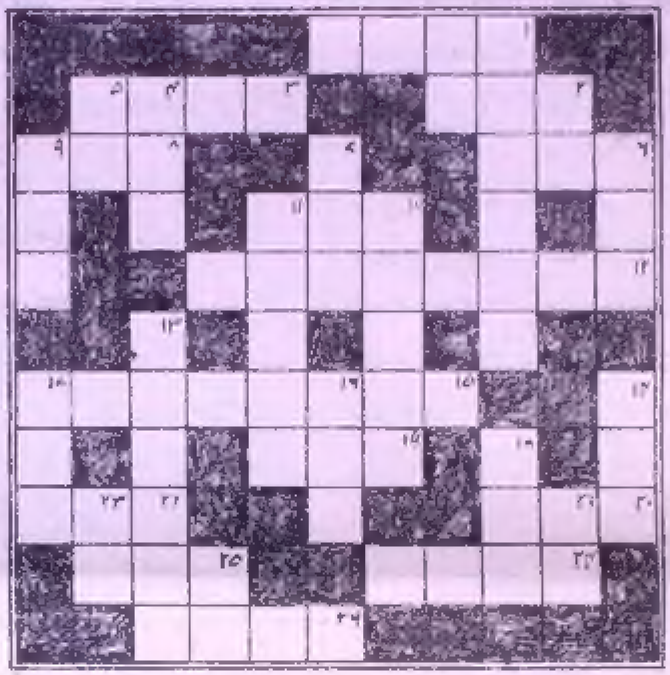
سال گزشتہ انجمن نے جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو اتر پردیش کے مشورے کے بموجب بجائے طباعت ماہانہ قلمی نسخہ نکالنا شروع کیا۔

انجمن ترقی اُردو ڈاسنہ نے اُردو تعلیم کو رواج دینے کے لئے انجمن شبینہ اسکول کھولا جس کے دو شعبے کر دیئے گئے۔ ایک تعلیم بالغان دوسرا تعلیم جامعۂ اُردو۔ ماہ جون ۱۹۶۳ء میں ڈاسنہ سینٹر سے کامیاب ہونے والے امیدواران جامعۂ اُردو کی اسناد تقسیم کرنے کے لئے ایک جلسہ کیا گیا جس کی صدارت جناب پنڈت سندر لال صاحب نے فرمائی۔ بعد ازاں مشاعرہ بھی ہوا۔

۲۸ر دسمبر ۱۹۶۳ء کو انجمن شبینہ اسکول ڈاسنہ کے طلبہ کا ایک تعلیمی پروگرام پیش کرنے کے لئے پھر ایک جلسہ جناب پنڈت سندر لال صاحب کی صدارت میں ہوا جس میں پنڈت جی کی تقریر صدق بیانی اور صاف گوئی کی ایک بہترین مثال تھی۔

طلبہ نے اقبال کا قومی ترانہ اور کنہیا لال کپور کا افسانہ (برج بانو) بصورت ڈرامہ پیش کیا، جس کو بہت پسند کیا گیا۔

اردو معمہ



اشارات:

افقی

۱- بھارت کی ایک پتھریلی زبان (۴)۔

۲- بجلی کی آواز (۳)۔

۳- گلشن دہر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے (۴)۔

۶- وظیفہ (۳)۔

۸- اس طرح (۳)۔

۱۰- ایک ایسا لفظ جس کے آخری حرف پر تین نقطے بھی لگا دیں تو معنی نہیں بدلتا (۳)۔

۱۲- دل کش صورت (۵-۳)۔

۱۵- بجا طور پر بابائے اردو (۵-۳)۔

۱۶- ایسے تین حروف جن کے الٹ پھیر سے بھی کوئی لفظ نہیں بنتا (۳)۔

۲۰- ایک ذو معنی، ذو تلفظ ہم املا لفظ (۳)۔

۲۲- ایران کی بڑھیا (۳)۔

۲۴- سماج کی گری ہوئی عورت (۳)۔

۲۵- حیاتین کا خزانہ (۳)۔

۲۶- غسل خانے کی ایک ضروری شے (۴)۔

عمودی

۱- ــــــ مرتے ہیں قبلہ نما آشیانے میں (۴-۳)۔

۴- سیج (۳)۔

۵- حباب (۲)۔

۶- قانون کی خلاف ورزی (۳)۔

۷- عشرت کا جزو لاینفک (۳)۔

۹- طوائف کا کام (۳)۔

۱۰- دشمنی کی علامت (۵)۔

۱۱- ایک مغربی زبان (۵)۔

۱۳- اقربا (۶)۔

۱۴- لسانی اعتبار سے غالب سے بڑا شاعر (۳)۔

۱۶- ایک ہم تلفظ، ہم املا لفظ؛ جس کے بدلنے سے معنی بھی بدل جاتا ہے۔ الٹ کر پڑھیں تو ایک اور موضوع لفظ (۳)۔

۱۷- سائنس کا ایک تجزیہ (۳)۔

۱۸- آج جس سے دنیا کی خالی ہے (۳)۔

۲۱- جسم کا سب سے ذہنی حصہ (۲)۔

۲۳- ایک ہندو کی آخری حاجت (۲)۔

۲۵- الٹ کر پڑھنے سے دو دو لفظ بنتے ہیں (۲)۔

نوٹ

یہ معمہ بطور آزمائش دیا جا رہا ہے۔ اگر اسے ہماری زبان کے پڑھنے والوں نے پسند کیا تو آئندہ اشاعتوں میں یہ سلسلہ جاری کیا جا سکے گا۔ فی الحال ہم آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں تاکہ فیصلہ کر سکیں کہ کب اور کن شرائط کے ساتھ جاری کریں۔ یا نہ کریں۔ اگر جاری کیا گیا تو خیال ہے کہ معمے کے صحیح حل کرنے والوں کو تحفۃً انجمن کی کتابیں دی جائیں۔ فیس داخلہ کچھ نہ ہو صرف کوپن بھیج دینا کافی سمجھا جائے۔ اس معمے کا حل جن صاحب کو دلچسپی ہو ۲۵ر اپریل ۱۹۶۴ء تک بھیج دیں اور عام قارئین اپنی رائے ضرور لکھیں۔

بقیہ

اُردو، ہندی کو زیادہ مؤثر بنا سکتی ہے

یہ تحریک عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ کے بائیکاٹ اور انھیں نکال باہر کرنے کی غرض سے شروع کی گئی تھی مگر اس کوشش میں خود ہندی کو ہزاروں جاندار الفاظ و محاورات سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اُردو نثر یا نظم کی کتاب کے کوئی دس صفحے اُٹھا کر دیکھئے اور دوسری طرف ہندی کے دس صفحے ملاحظہ فرمائیے تو آپ کو اوّل الذکر میں آخر الذکر کے مقابلے میں پانچ سے لے کر دس گنے زیادہ ہندی کے الفاظ، محاورات اور فقرات ملیں گے۔

اُردو سے نفرت

میں ایک چوتھائی صدی سے تقریباً ناقابلِ برداشت روحانی کرب کے ساتھ ہندی پریمیوں کے اُردو سے واقعی نفرت کے رویّہ کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ اور محبانِ اُردو کو جنہیں ہندی کا دشمن کہا جاتا ہے، ہندی سے گہری اور والہانہ دلچسپی لیتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ ہندی ادبیات میں، ہندی الفاظ و محاورات کا استعمال غیر مؤثر طریقے پر کیا جاتا ہے جب کہ اُردو میں ان کا استعمال نہایت فطری انداز میں ہوتا ہے۔ پندرہ فی صدی خواندگی کے باوجود ہندی پڑھنے والوں کی تعداد تقریباً انگلینڈ کے انگریزی پڑھنے والوں کی تعداد کے برابر ہے۔ پھر بھی ہندی شاعری کے پڑھنے والوں کی تعداد، جبکہ وہ نصاب میں طلبہ کے لئے لازمی قرار دی جاتی ہے، مشکل سے چند سو ہے جو انگلینڈ کے انگریزی شاعری پڑھنے والوں کی تعداد کا ½ حصّہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عام لوگ کھڑی بولی ہندی شاعری کی کوئی کتاب نہیں خریدتے، جس کی حیثیت ایک مردہ پیدا شدہ بچہ کی ہے یا جو پیدائش کے بعد جلد ہی فوت ہو جانے والا ہے۔

علاج

اس کا علاج کیا ہے؟ ہندی کے اس گندے اصطبل کی صفائی کا کام ہرقل کے بس کا ہی ہے۔ ہندی اور اُردو کی دو شاخوں میں تقسیم اور انہیں نیچے سے اوپر تک کے درجوں میں الگ الگ پڑھائے جانے کی اسکیم ایک فاش غلطی ہے جسے ختم کرنا ہوگا۔ ہندی اور اُردو کے شعبوں کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایک دوسرے سے ملا دینا ضروری ہے اور ان دونوں زبانوں کو اختیاری مضامین کے بجائے لازمی قرار دینا چاہئے۔ دونوں شعبوں کو مشترک اور ناقابل تقسیم بنانا چاہئے۔ ان زبانوں کے اساتذہ کو مساوی یا تقریباً مساوی طور پر کھڑی بولی کے ہندی اور اُردو اسلوب، اُردو ادب اور ہندی ادب اور ان کے رسم خط سے بخوبی واقفیت حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

صرف اس طریقۂ کار سے ہی ہندی کے علاقے کی زبان وقت کے ساتھ ایک واحد ادب پیدا کر سکتی ہے اور صرف اسی طرح سے ہم اچھے لکھنے والوں کو بھی جنم دے سکتے ہیں جو اپنے بہترین کارناموں کی قدر و قیمت سے مالا مال ہو سکیں گے۔ اُسے محفوظ کر سکیں گے اور اپنے کام کو آئندہ جاری بھی رکھیں گے۔ یہ کام اسی زبان میں ہوگا جسے ہم آج تک اُردو ہندی کہتے چلے آئے ہیں۔ بفرضِ امکان جو بظاہر محال معلوم ہوتا ہے اُردو زبان و ادب مستقبل کی ہندی کو زیادہ مؤثر بنا سکتے ہیں۔ بہ نسبت اس مہمل زبان کے جو آج ہندی نثر اور نظم کی زبان ہے صرف اسی طرح سے ہندی علاقے کی زبان و ادب اپنی حیثیت حاصل کر سکیں گے۔ اور صرف اسی طریقہ سے ہندی جسے ہندوستان کے تمام ذرائع، وسائل اور قوتیں حاصل ہیں، ہندی بن سکے گی۔

شاخ بھاگل پور کا تعزیتی جلسہ

انجمن ترقی اُردو شاخ بھاگل پور کے زیر اہتمام ۲۲ر مارچ ۶۴ء کی شام کو جناب آنند موہن سہائے سابق سفیر ہند (تھائی لینڈ) کی صدارت میں یوم ایوب ایڈوکیٹ (سابق صدر ریاستی انجمن ترقی اُردو) منایا گیا۔ ڈاکٹر محمد یونس صدر شاخ بھاگلپور نے مرحوم کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جناب تونس شاغل اور اشرف جنرل سکریٹری شاخ بھاگل پور نے مرحوم کی مدح میں اپنی اپنی نظمیں پڑھیں۔ آخر میں تجویز تعزیت منظور کی گئی۔

صدر مجلس جناب آنند موہن سہائے نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انکشاف فرمایا کہ ناتھ نگر گرلس ہائی اسکول میں اُردو پڑھانے کا خاطر خواہ انتظام رہنے کے باوجود اُردو پڑھنے والی لڑکیوں کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔ کاش محمد ایوب مرحوم جیسے رہنما سے ان کی حیات میں میری ملاقات ہوتی تو میں انھیں اُردو داں طبقہ میں لڑکیوں کی تعلیم کا ذوق پیدا کرانے کے لئے انھیں ناتھ نگر ضرور لاتا۔ موصوف نے بھاگلپور یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ سینیٹ کا ایک ممبر ہونے کی حیثیت سے مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا اس کے لئے کروں گا۔ (غیاث اثر)

سخاوت مرزا

آگرہ کا ایک مشاعرہ

شعبان ۱۳۰۰ ہجری مطابق ۱۸۸۳ء

ایک گلدستہ "گلدستۂ سخن" کے نام سے آگرہ سے نکلتا تھا۔ کب تک جاری رہا؟ فی الحال معلوم نہ ہو سکا جس میں مشاعرہ کی روئداد اور شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا، اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشاعرہ ایسا ہوتا تھا کہ ہندوستان کے دوسرے بڑے بڑے مراکز سے مصرعۂ طرح بھیج کر غزلیں طلب کی جاتی تھیں۔ بلکہ مقامی طور پر بزم مشاعرہ آراستہ کر کے غزلیں بھیج دی جاتی تھیں۔ چنانچہ اس مجموعہ میں زیادہ تر حیدرآباد دکن، ٹونک اور رام پور کے شعرا کی غزلیں بھی درج ہیں اور اسکی صراحت بھی ہے۔ مثلاً مشاعرہ ریاست بھوپال (فارسی)۔ مشاعرہ حیدرآباد دکن (اردو) صفحہ ۱۹۔ غرض فارسی و اردو، دونوں میں طبع آزمائی ہوتی تھی۔ روئداد کا ملخص یہ ہے۔

غزل رند لکھنوی ساکن حیدرآباد دکن :-

ہے زیست مری ضعف سے اب موت کا خاکا
اس عشق نے رکھا نہ فنا کا نہ بقا کا

فرماتے ہیں اس امر میں حیرت تمہیں کیا ہے
انساں جسے سمجھے ہو بگولا ہے ہوا کا

جس سے پتہ چلتا ہے کہ سید محمد خاں رند بھی حیدرآباد دکن آئے تھے۔

ششدر، تلمیذ فیض حیدرآبادی کے حسب ذیل تلامذہ کی غزلیں بھی ہیں :-

حاذق (حکیم محمد صالح)، تلمیذ عباس حسین خاں ششدر :-

شادی کا کہیں غل ہے کہیں شور بکا کا
اک رنگ پہ عالم نہیں اس دار فنا کا

نشتر (میر حیات علی)، تلمیذ ششدر :-

کیا حال کہیں وحشی انداز و ادا کا
ہر داغ جگر پھول ہے قبر شہدا کا

دیگر تلامذۂ ششدر میں حسب ذیل شعرا قابل ذکر ہیں :-
میر محمد علی خاں (سلیمان)۔ تلجا پرشاد (ساقی)۔ امیر علی (اظہر)۔ میر کرم علی (خرم)۔ میر فدا علی (مضطر)۔ میر حسن علی (انگر)۔

تلامذہ ناجی (ساکن حیدرآباد) میں مظفر یاب خاں (یاور)۔ سید محمد علی (کرم)۔

اور دوسرے شعرا میں۔ واقف شاگرد قربان علی بیگ سالک تلمیذ غالب۔ حکیم محمد یعقوب خاں اعجاز۔ ساکن حیدرآباد دکن تلمیذ خیالی بھوپالی۔ جن سے میری بھی ملاقات تھی۔ معمر شخص تھے، بیدر میں وکالت کرتے تھے۔۔۔ ان کا مجموعۂ کلام طبع و شائع ہو چکا ہے۔ میں ۱۹۲۹ء میں عدالت ضلع بیدر کا سررشتہ دار تھا، اعجاز صاحب زندہ تھے۔ بڑے مزے کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ اپنا ایک شعر سنایا ؎

کبھا مل جائے گی یا غرق آب ہو جائیگی
ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

ایک مرتبہ فرمایا کہ بھئی آج کل ترقی بغیر سرپی کے نہیں مل سکتی اور ایک رباعی کہی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے :-

کہاں کی سول لسٹ کہاں کا گریڈ
مربی بسیار و مربہ بخور

کہنے لگے کہ بیدر کے بعض غنڈے ایک طوائف شیعہ مذہب کے مکان پر پہنچے اور اس کو مجبور کیا کہ "ل چار یار" تو اس نے برجستہ جواب دیا کہ تم چار یار کیا کہتے ہو، میرے تو بارہ یار ہیں" یعنی اثنا عشر"۔ خاں صاحب کا ایک شعر مشاعرے کا یہ ہے ؎

کاہش کو مری دیکھ یہ کہتی ہے خدائی
بھایا ہے اسے طرز کسی ماہ لقا کا

جھانکے چند، رامی، حیدرآبادی فرماتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو حال دل اس بے سر و پا کا
بت کا کبھی قایل، کبھی بندہ ہے خدا کا

مشہور ہے کہ ان پر کسی نے پھبتی کسی۔ ع :-
ایک بیا انکا بھی نہیں کہتے ہو تم جھانکے چند ؟

اساتذۂ وقت میں، میر احمد علی عصر، تلمیذ فیض حیدرآبادی بڑے جید شاعر تھے۔ ان کا غزلیات کے سوا رباعیات کا دیوان بھی ہے۔ اس مشاعرہ کی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

دلدادہ ہوں پری کا نہ کسی حور لقا کا
حیران ہیں کشتہ ہوں تری ناز و ادا کا

سیتل پرشاد، خرم تلمیذ فیض ؎

مینھ برسے ہے گل پھولے ہے جھونکا ہے ہوا کا
ساقی دے مجھے جام کہ موسم ہے فضا کا

بینی راجہ، باقی تلمیذ فیض کے شاگردوں میں، کیشو پرشاد، شاد خلف بینی راجہ باقی۔ گردھاری لعل بلند (تلمیذ باقی)۔ بھوانی پرشاد، نفیس (تلمیذ باقی) قابل ذکر ہیں۔

پیغمبر سخن محمد سلطان عاقل تلمیذ غالب مدعی ہیں :-

یکجے فرض ہے ہو طور پہ دیدار خدا کا
اک جلوہ ہے کافی صنم ہوش ربا کا

تعلیم سخن حسب حکم خداوند سخن ہے
عاقل میں پیمبر ہوں گروہ شعرا کا

ان کا دیوان طبع ہو چکا ہے ۔

غیر طرحی غزلوں میں، کلب علی خاں نواب رام پور کا ایک شعر یہ ہے ؎

بانکپن ہو کسی ہمسر سے تو کچھ لطف اُٹھے
مر رہا ہوں میں عبث رکھتے ہو کاوش مجھ سے

مسلمان خاں اسد لکھنوی نے نواب حافظ ابراہیم خاں خلیل والی ٹونک کی غزل پر ایک مخمس کہا تھا۔

فارسی طرح مشاعرہ منعقدہ ریاست بھوپال سے متعلق حسب ذیل شعرا کی غزلیں ملتی ہیں :۔ بچولال تمکین تلمیذ فیض حیدرآبادی ۔ انبا پرشاد خلم حیدرآبادی ۔ جوالا پرشاد فاضل ۔ احمد خاں صوفی اکبر آبادی ۔ رام نراین شفیق سانگن کول ۔

حیدرآباد کا مقصدی مشاعرہ

مسٹر وی. کے. ڈھگے سابق رکن پارلیمنٹ حیدرآباد کے ان قائدین و رہنماؤں سے ہیں جن کی زندگی کا مقصد سماجی فلاح و بہبود، انسانی مساوات، باہمی اخوت و محبت اور قومی اتحاد و اعتماد ہے۔ "رادھا کشن ہوم" ان کے ایثار کا ایسا کارنامہ ہے جو رہتی دُنیا تک رہے گا۔

ملک میں حالیہ تنازعات کے پیش نظر آپ کو خیال آیا کہ روک تھام کے لیے اور برقراری امن و امان کے لئے حکومت کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں اور عوام کی طرف سے بھی موثر عملی تدابیر اختیار کی جائیں چنانچہ ڈھگے صاحب نے نمائش کلب کے ہال میں ۱۴ر مارچ ۱۹۶۴ء گاڈی کے دن جو یہاں کے فصلی سال اور موسم بہار کا پہلا دن ہے رات کے نو بجے ایک طرحی و مقصدی مشاعرہ کیا۔ چونکہ ۱۹۶۴ء مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی کی صد سالہ سالگرہ کا بھی سال ہے اور مہاراجہ شاد مرحوم کی شگفتہ شخصیت میں جملہ مذاہب کے محاسن تھے اور ان کا دربار صوفیوں، شاعروں، مولویوں اور پنڈتوں سے معمور تھا اس لئے ان کی مثنوی مہ یم درپن کا ایک شعر مصرعِ طرح قرار دیا گیا اور یہ مشاعرہ مہاراجہ کا یادگاری مشاعرہ تھا۔

شاد کا مذہب شاد ہی جانے آزادی آزاد ہی جانے

مصرع طرح :۔

میں ہوں ہندو میں ہوں مسلماں ہر مذہب ہے میرا ایماں

قافیہ قافیہ

قومی یک جہتی نظم کا عنوان قرار دیا گیا۔ مقامی شعرا نے مخلصانہ جذبے کے ساتھ مسٹر ڈھگے کی آواز کو لبیک کہا اور مشاعرے میں شرکت کی۔ حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار و معززین سامعین کی شرکت نے اس بزم سخن کے وقار کو بہت بلند کر دیا۔

نمائش کلب کو پنجابی پھلکاری کے ریشمین و رنگین پردوں سے سجایا گیا تھا۔ جھاڑ فانوس کی نظر افروز روشنی تھی۔ سب سے پہلے ڈھگے صاحب نے قومی یک جہتی کی شمع فروزاں کی پھر تخت صدارت پر علامہ حیرت بدایونی کو بٹھا کر ان کی گلپوشی کی۔ صدر نے پُر مغز تقریر صدارت فرمائی۔ پھر یکے بعد دیگرے شعرا کو تخت پر بلا کر شمع کے سامنے پڑھوانا شروع کیا۔ مسٹر ڈھگے نے ہر شاعر کی گلپوشی کی اور ہر شاعر کو بیدری صنعت کا ایک حسین و جمیل تحفہ بھی نذر کیا جس پر نقرئی حروف میں مہاراجہ آنجہانی کا طرحی شعر ثبت کیا گیا تھا۔ دکنی مشرقی روایات و خصوصیات کے ساتھ یہ اپنی قسم کا سب سے پہلا مشاعرہ سنجیدگی و شگفتگی کی خوشگوار و دلچسپ فضا میں رات گئے ختم ہوا جس سے ہر طبقہ کی معزز و محترم خواتین بھی محظوظ ہوئیں۔

شعرا کے کلام کا مجموعہ شائع کیا گیا ہے اور حسب طلب بلا قیمت روانہ کیا جائے گا۔ توقع ہے کہ ہندوستان کے ہر چھوٹے اور بڑے مقام پر ایسے مقصدی مشاعرے کئے جائیں گے تاکہ تحریک کو تقویت حاصل ہو اور طبقہ شعرا بھی ملک کی خدمت میں دیگر سیاسی جماعتوں کے پیچھے نہ رہے۔

(حافظ حیدرآبادی)

مشاعرہ ساگر

ادارہ نامی کے تعاون سے گذشتہ شب چودھری معراج الحق صاحب کے دولتکدے پر جناب میاں محمد حسین خاں صاحب مہر ساگری کی صدارت میں غیر طرحی مشاعرے کی ایک مختصر مگر خوشگوار نشست ہوئی جس میں ساگر کے مندرجہ ذیل شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ جناب نسیم بھیلسوی ۔ جناب حاذق ۔ جناب انجم ۔ جناب کوثر ۔ جناب ساغر اور جناب اخلاص ۔ سامعین میں محمود رضا صاحب ڈی. ایف. او ساگر ۔ ایم چند ماتھر صاحب ڈپٹی کلکٹر ساگر ۔ فاروقی صاحب ریٹائرڈ اے ڈی ایم ۔ بقاء اللہ صاحب ریٹائرڈ اے ڈی ایم ۔ پروفیسر وید انندی ، اور جناب شمشیر جنگ بہادر (سابق اے ڈی ایم) وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔

(سلام ساگری)

عبدالقادر سروری

تبصرہ

صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات:

انجمن ترقی اردو ہند کی حالیہ مطبوعات میں ایک اہم اضافہ ہے جسے جناب محمد عتیق صدیقی نے مرتب کیا ہے۔ عتیق صاحب اس سے پہلے فورٹ ولیم کالج کے ناظم ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور اس کے عہد سے متعلق اور صحافت پر تصنیف اور ہندوستانی ادب کی شروعات پر انگریزی میں ایک کارنامہ شایع کرکے ادبی دنیا میں ایک مقام حاصل کر چکے ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۳ء کے درمیان صوبہ شمالی و مغربی میں جو مطبعے قائم تھے اور ان سے جو اردو اور فارسی اخبارات شایع ہوتے تھے اور کتابیں چھپتی تھیں ان کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ ہند پر انگریزوں کے تسلط کے زمانے میں اخبارات، رسایل، مطابع اور کتابوں کی اشاعت کی تفصیلی کیفیت لفٹنٹ گورنر کی معلومات کے لئے مرتب کی جاتی تھیں۔ ان میں دیسی اخباروں اور مطبعوں کی تفصیلات بھی شامل ہوتی تھیں۔ گورنمنٹ پریس الہ آباد نے ۱۸۶۰ء میں ان کیفیتوں کے اقتباسات چھاپے تھے جن میں چوتھی جلد دیسی اخبارات اور مطابع کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اسی میں اردو اور کچھ فارسی اخباروں اور مطبعوں کے بارے میں رپوٹیں اور ان پر تبصرے بھی شامل ہیں جنھیں جناب محمد عتیق صاحب نے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے آج سے تقریباً ایک سو برس پہلے کے اردو اخبارات اور مطابع کے بارے میں بہت اہم اور مفید معلومات ہماری دسترس میں آگئی ہیں۔ یہ معلومات ہماری صحافتی، علمی اور ادبی تاریخ کا نہایت اہم سرمایہ اور ماخذ ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے اردو دنیا کو اس بات کا بہت کم اندازہ تھا کہ آج سے ایک سو برس قبل، اردو کی خدمت گذاری کون کون سے مطبعے کر رہے تھے اور ان سے کون کون سے اخبار اور رسایل وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے اور کون سی مطبوعات منظر عام پر آئیں۔

ان رپورٹوں کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان میں اخباروں کی تعداد اشاعت اور خریداروں کی تفصیل کے علاوہ ایسے تبصرے بھی شامل ہیں جن سے اخباروں کے مسلک، ان کے معیار اور لب لہجہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح ان چھ برسوں کے جملہ (۴۴) اخبار اور تقریباً (۳۶) مطبعوں کے بارے میں بڑی اہم اور کام کی باتیں ہماری دسترس میں آگئی ہیں۔ ضمیمے میں ۱۸۵۸ء کے اخباروں کی تفصیل بھی دی گئی ہے جس سے اس سال کے اخباروں کا حال بھی ہم کو معلوم ہو جاتا ہے۔

اس سال کے اخباروں میں اکثر تو وہی ہیں جن کا حال پچھلے چھ سال کے اخباروں کے سلسلے میں آگیا ہے۔ لیکن دو اخبار یعنی "فواید الناظرین" اور "قران السعدین" کا اس سال اضافہ ہوا ہے۔

اخبار جن جن شہروں سے نکلتے تھے ان کی تفصیلات بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ اخبار آگرہ، دہلی، بنارس، لاہور، میرٹھ، بریلی، کان پور، شملہ، گوالیار، بھرت پور، اندور، اور سیالکوٹ سے نکلتے تھے۔ سب سے بڑی تعداد آگرہ اور بنارس سے نکلتی تھی اور عجیب بات یہ ہے کہ بنارس سے شایع ہونے والے اخباروں کی تعداد اتنی ہی تھی جتنی آگرہ کے اخباروں کی۔ اس کے بعد دہلی کا نمبر آتا ہے۔ ان اخباروں اور مطبعوں کے مہتمم کون کون تھے؟ اس کا مطالعہ بھی بعض بنیادی حقایق کو منظر عام پر لاتا ہے۔ مثلاً ۱۸۴۹ء کے (۲۶) اخباروں میں سے (۱۰) کے مہتمم مسلمان اور (۱۴) کے ہندو ہیں۔ ایک اخبار کے مہتمم ایک یورپی مستشرق مسٹر فیلن تھے جنھوں نے اردو کی ایک مستند لغات مرتب کی تھی اور منشی کریم الدین کی رفاقت میں اردو شعرا کا ایک تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" بھی لکھا تھا۔

۱۸۵۰ء کے اخباروں میں سے (۱۲) کے مہتمم مسلمان اور (۱۴) کے ہندو تھے۔ کم و بیش یہی صورت حال اور برسوں کے اعداد و شمار کی بھی ہے۔ اس عدد شماری سے کوئی خاص مقصد حاصل ہو یا نہ ہو، ایک بات پر اس سے ضرور روشنی پڑتی ہے کہ اردو سے کام لینے والوں میں فطرتاً ہندو زیادہ تھے جو صحافتی، علمی اور ادبی نقشہ یہ تفصیلات پیش کرتی ہیں، وہ فکری توافق اور ذہنی ہم آہنگی کی عمدہ مثال ہے۔ یقیناً یہ وہ زمانہ تھا، جب لسانی فرقہ واریت سے ذہن ناآشنا تھے۔

ایک اور بات بھی جاذب توجہ ہے۔ اخباروں اور خاص طور پر بعض وقت ایک ہی شہر سے اخباروں کی ایک کافی تعداد کے شایع ہونے سے ان کے معیار، لب لہجہ اور پیش کشی کا انداز، سارے ہی پہلو متاثر ہوتے تھے۔ اس کے باوجود کئی اخباروں کی اپنے معیاروں کو قائم رکھنے کی مسلسل کوشش ایک مستحسن عمل تھا۔ پھر بھی ہم یہ تمنا کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان اخباروں کی تعداد اس سے کم ہوتی جتنی کہ ہر سال اور ہر عہد میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ ممکن ہے کہ تعداد کی زیادتی سے بعض مورخین غلط نتایج استنباط کرنے کی طرف مایل ہوں۔ لیکن یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کم سے کم ایک ہی شہر میں اخباروں کی کثرت نہ ہو تو ان کے

معیار لازماً بلند سے بلند تر ہو سکتے ہیں۔

"صدر الاخبار" جو آگرہ سے نکلتا تھا۔ اُسکے ایڈیٹر آگرہ کالج کے استاد مسٹر ٹِنِک تھے۔ اس اخبار کا مقصد سائنسی علوم کی اشاعت تھی۔ ٹِنک کے انتقال کے بعد مسٹر فیلن اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ اور اخبار کا نام بدل کر "اخبار الحقایق" رکھا گیا تھا۔ اخبار ہمارے زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی خبر رسانی اور تبصرہ کے علاوہ اور کئی طرح کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ مثلاً جب ان اخباروں کو روپیہ کی ضرورت ہوتی، راجوں اور مہاراجوں کے خلاف خطرناک یا شرمناک خبریں بنا کر شایع کر دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اکثر راج مہاراج، اخباروں کی امداد محض اس مقصد سے کرتے تھے کہ انکا پردہ فاش نہ ہو۔ آج بھی یہ دیرینہ رسم قایم ہے۔ صرف مخاطب بدل گئے ہیں۔

"زبدۃ الاخبار" آگرہ کا ایک معتبر اخبار تھا جو تقریباً اس سارے دوران میں شایع ہوتا رہا۔ اس کی آمدنی کا تذکرہ کرتے ہوئے رپورٹ میں لکھا ہے "خریداروں سے زبدۃ الاخبار کی آمدنی تقریباً ایک سو چالیس روپیہ ماہوار ہے۔ اس رقم کے علاوہ دور و نزدیک کے ان راجوں اور نوابوں سے بھی سو روپے کے قریب مل جاتے ہیں جو اس اخبار کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے متمنی رہتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اس اخبار میں کوئی ایسی بات نہ چھپے جس سے ان کی سبکی ہو۔"

اخباروں کے تبصروں میں سے کچھ تبصرے ایسے بھی ہیں جو ایڈیٹر یا مہتمم کے لیے یقیناً رہنمائی اور بصیرت افروزی کا باعث ہوتے تھے مثلاً اخبار النواح پر ایک تبصرہ ہے۔

"اس سال اخبار اس قابلیت سے مرتب نہیں کیا گیا جیسا کہ سابق میں کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس سال علمی مضامین اس میں نظر نہیں آئے۔" "قطب الاخبار" کا نام بعد میں بدل کر "قطب الاخبار و تذکرۃ الاشعار و احکام سرکار و تواریخ الاخبار" رکھا گیا تھا۔ اس پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ "اس کا نام بہت طویل ہو گیا ہے۔"

کئی اخبار ایسے تھے، جن میں ماہوار یا ب ایڈیٹر کام کرتے تھے۔ ان ایڈیٹروں، کاتبوں، محاسب، اور دوسرے عملے کی تنخواہوں کا اندازہ بھی ہم کو رپورٹوں کے اندراجات سے ہوتا ہے۔ "اخبار الحقایق" کے ایڈیٹر کو پندرہ روپیہ ماہوار ملتی تھی۔ کاتب کو دس روپے۔ محاسب کو (۷)، پریس مین کو (۷)۔

رپورٹوں میں خریداروں کی تفصیل بھی درج کی جاتی تھی۔ "اخبار الحقایق" کے سنہ ۱۸۴۹ء کے خریداروں میں (۲۴) ہندو (۲۳) مسلمان اور (۱۵) عیسائی تھے۔ "نور الابصار" کے سنہ ۱۸۵۳ء کے خریداروں میں (۱۹) ہندو۔ (۳) مسلمان اور (۲۱۹) یوروپین اور سرکاری محکمے۔

مطبعوں سے کتابوں کی جو تعداد چھپتی تھی، اُس سے موضوعات اور بعض کتابوں کی مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ "خالق باری"۔ "کریما"۔ "پنجاره نامہ" شاید سب سے زیادہ مقبول کتابیں تھیں جو متواتر چھپتی رہیں۔ بعض کتابیں جن کے چھپنے کی اطلاع ہم کو اس کتاب سے ملتی ہے۔ اب، شاید اُن کے نام ہی باقی رہ گئے ہیں۔

مرتب نے جگہ جگہ فٹ نوٹ اور حاشیے بھی دئے ہیں، جن سے کتاب کی افادیت میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔ تاہم بعض جگہ فٹ نوٹ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ کئی کتابوں کے نام ایسے ہیں، جو حل نہ ہو سکے ان پر سوالیہ علامت لگا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ رومن سے اُردو میں منتقل کرتے ہوئے بھی بعض کتابوں کے ناموں میں تسامح ہو گیا ہے۔ مثلاً مطبع کوہ نور سے چھپی ہوئی ایک کتاب کا نام "وشنو پودرن" چھپا ہے۔ اصل میں "وشنو پُران" ہے۔ اس طرح مطبع بنارس سے چھپی ہوئی کتاب "سندرک" نہیں "ساہدیک" ہے۔ اور مطبع جام جہاں نما سے طبع شدہ کتاب "پوتھی بھگت مل" نہیں "پوتھی بھگت مال" ہے۔ "اسود الاخبار" اور "مطلع الاخبار" وغیرہ کی "ہفتے وار اشاعت" نہیں "ہفتہ وار اشاعت" ہونا چاہیے۔

اخباروں کے صفحہ اول کے چربوں اور نقشوں سے اس کتاب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

مالک انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ۔ پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا۔